وارث علوی کا تنقیدی اسلوب

Critical Style of Waris Alvi

ظہیر عباس،اسسٹنٹ پروفیسر،گورنمنٹ کالج راوی روڈ،لاہور
مظہر عباس،اسسٹنٹ پروفیسر،اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

Abstract

Waris Alvi is a prominent critic of fiction in Urdu. Beside it, he has parted a major role to build the theory based upon pure literary standards against the inflexible critical system of Tarraqi Pasand critics. Waris Alvi has played a significant role in Urdu criticism but he has not appreciated as much. It is necessary to study his thoughts as a whole and present it for the guidance of Urdu critics as well Urdu fiction writers. In this article, a discussion has been opened after analyzing briefly the style of this prominent Urdu critic and it willopen a window for the Urdu criticism and studies of fiction.

Keywords: Waris Alvi, Urdu Criticism,. Style, Progresseive Writers, Urdu Fiction, Aesthetics of Literature

> ''تنقید رابطہ ہے قاری اور قاری کے بیچ،قاری اور فنکار کے بیچ اور نقاد اور فنکار کے بیچ۔اپنی آخری شکل میں تنقید گفتگو ہے۔۔اہل علم کی اہل علم سے،اہل دل کی اہل دل سے،خوش طبعی ہے یاروں کے بیچ،بے تکلفی ہے احباب کے درمیان،بحث وتکرار ہے ہم مشربوں سے،چھینا جھپٹی ہے مخالفوں سے،پھکڑ اور ٹھٹھول ہے حریفوں سے،آپ کچھ بھی کہیے،ادب میں ہنگامہ آرائی،چہل پہل اور گرما گرمی کی پہچان تنقید کے مزاج پر ہی قائم ہے۔''☆۱

یہ چند حروف وارث علوی کے تنقیدی مزاج کی عکاسی کرتے ہیں۔جدید اردو تنقید میں وارث علوی اپنے مخصوص جارحانہ اندازِ نقد اور منفرد افسانوی اسلوب سے ہر سطح کے قاری کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔اردو تنقید میں وہ واحد ایسے نقاد ہیں جو خشک تنقیدی منطق کے دائروں کو توڑتے ہیں اور جمالیاتی اقلیم کی سرحدوں کو چھوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔فکر و جذبہ جب من وتو کی تفریق سے آزاد ہوتے ہیں تو تخلیق وجود میں آتی ہے۔لیکن تخلیق کی پرکھ ہمیشہ شعور سے کی جاتی ہے۔وارث علوی کا معاملہ بڑا عجیب ہے۔تخلیق سب سے پہلے ان کے جذبات میں تلاطم

پیدا کرتی ہے اور دوسرے مرحلے میں وہ اس کا تجزیہ کرتے ہیں۔فن پارے میں سے گزرتے ہوئے نقاد یا تو اپنے تجزیاتی شعور کو اتنا بیدار رکھتا ہے کہ وہ پل پل ٹھہرتا ہے، جھومتا ہے اور آگے بڑھتا ہے اور یا وہ ہر جز کو اپنے شعور کا حصہ بناتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور جب وہ منزلِ مقصود پر پہنچتا ہے تو جھوم جھوم جاتا ہے۔ ہمارے ہاں پہلی قسم کے سب سے بڑے نقاد عسکری ہیں جنہیں پڑھتے ہوئے ہمیں پل پل ٹھہرنا پڑتا ہے اور دوسری قسم کے بڑے نقاد وارث علوی ہیں جن کی تنقید سے ہمارا مکالمہ اسی رواں زبان سے ہوتا ہے جس زبان میں وہ تخلیق سے محوِ گفتگو ہوتے ہیں۔

اردو تنقید کا ایک بہت بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ ہم نے ادبی ناقدین کے نام پر ایسے مفکرین زیادہ پیدا کئے ہیں جن کا تخلیقی ادب کا مطالعہ ذرا وا جبی سا رہا ہے جبکہ غیر تخلیقی تحریریں ان کا اوڑھنا بچھونا رہی ہیں۔ادبی تنقید کے نام پر ان لوگوں نے جو لکھا اس نے ادب کے عام قاری کی الجھنوں میں کمی کی بجائے اضافہ ہی کیا۔لیکن وارث علوی باضابطہ ادبی نقاد ہیں۔وہ ادبی تھیوری پر ایمان نہیں لائے بلکہ عالمی فکشن کے اندر سے انہوں نے ان tools کو تلاش کیا جو کسی فن پارے کی تفہیم میں مددگار ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر سب سے پہلے ہماری جمالیاتی حسیات کو متاثر کرتی ہے۔اگرچہ وہ خود اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ تخلیق کار کھلی آنکھ سے حقیقت کا تجزیہ کرتا ہے اور تنقید میں بھی یہی ہمت ہونی چاہیے لیکن میرے نزدیک تخلیق کا کمال یہ ہے کہ وہ آپ پر ایسی حیرت منکشف کرے کہ آپ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں۔فن پارے کے اختتام پر آپ اچانک دنیائے شعور میں واپس آئیں، پھر فکری حوالے سے تحریر کی معنویت جانچنے کی کوشش کریں۔ان کی تنقید بھی ہمارے ساتھ کچھ ایسا ہی سلوک کرتی ہے۔وارث علوی پر تخلیق کار کی طرح تنقید کا نزول ہوتا ہے۔ان کی تحریر کا تخلیقی وار کبھی کبھی اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ ان کے لیے قلم روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔وہ تخلیقی عمل سے تنقیدی فن پارے تخلیق کرتا ہے۔

وارث علوی بنیادی طور پر فکشن کے آدمی ہیں۔نظریاتی اور عملی حوالے سے فکشن پر ان کے کام کی نظیر نہیں ملتی۔''فکشن کی تنقید کا المیہ''، ''جدید افسانہ اور اس کے مسائل''، ''ادب کا غیر اہم آدمی''، ''لکھتے رقعہ، لکھے گئے دفتر'' اور ''بورژوا ژی بورژوا ژی'' ایسی لاجواب تصانیف ہیں جو فکشن کے سنجیدہ طالب علم کے لیے فکشن کی پر تجسس اور متحیر دنیا میں داخل ہونے کے لیے رہبرِ کامل کا کردار ادا کرتی ہیں۔وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہماری جدید تہذیب کا پروردہ سہل انگار قاری مکتبی تنقید اور صحافیانہ تنقید تو بڑے شوق سے پڑھتا ہے لیکن ہر وہ تحریر جو اس کا فکری جمود توڑنے کی کوشش کرتی ہے، اسے کارِ بیکاراں نظر آتی ہے۔چلو مان لیا کہ ہمارے ہاں پڑھنے والے موجود ہیں لیکن سمجھنے والے کتنے ہیں؟ موجودہ عہد میں تخلیق کی تفہیم اچھی تنقید کے بغیر ممکن نہیں رہی بلکہ اب تو تنقید تخلیق سے آگے بڑھ کر تہذیبی و کائناتی مسائل سے آنکھیں چار کرتی نظر آتی ہے۔

بات ہو رہی تھی وارث علوی کے تنقیدی اسلوب کی اور ہم کہاں نکل آئے۔ہم اگر اپنے تہذیبی وجود کی جڑوں کی تلاش میں نکلیں تو قصوں اور کہانیوں کی طلسمی فضاؤں میں جا نکلتے ہیں۔آج بھی کوئی نانی اماں کہانی کے

پردے میں کوئی اخلاقی رمز بیان کرتی ہوئی نظر آ جاتی ہیں۔ ہمارے تہذیبی مزاج کی تربیت میں قدیم تماثیل اور داستانوں کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ رموزِ حیات ہمیشہ ہلکی پھلکی کہانی کی شکل میں ہی بیان کیے جاتے رہے ہیں اور کہانیاں سننے والے ہر سطح کے افراد ہوتے تھے۔ کچھ کہانی سے ہی لطف اندوز ہوئے تو کچھ نے کہانی سے گوہرِ مراد پا لیا۔ دونوں خوش۔

وارث علوی کی تنقید بھی ہر دو سطح کے قارئین کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ اردو کے ایسے ممتاز نقاد ہیں جن کی تنقید، تنقید افسانہ معلوم ہوتی ہے اور افسانوی زبان میں تنقید لکھنا اتنا ہی کٹھن ہے جتنا حکایات کے پردے میں سلوک و معرفت کی گفتگو کرنا۔ ایک مرشدِ کامل سالکِ رہِ حق کی یوں نامحسوس طریقے سے تربیت کرتا ہے کہ مقامِ حیرت پر پہنچ کر ہی اسے خبر ہوتی ہے کہ وہ کتنا سفر طے کر چکا ہے۔ وارث علوی کی تنقید بھی ہمارے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتی ہے۔ ''فکشن کی تنقید کا المیہ'' اس کی بہترین مثال ہے۔

وارث علوی کی یہ کتاب تخلیقی نثر (مخصوص معنوں میں) کا بہترین نمونہ ہے۔ اگر مسافر تانگے پر سوار ہونے سے ہی انکاری ہو تو وہ وہیں کا وہیں رہ جاتا ہے۔ اس کی حالت پر کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں ان کی تنقید شعر کا لطف دیتی ہے۔ وہ خود ہی کہتے ہیں:

> ''نثر کا اپنا ایک بنیادی حسن ہے جو شاعری کے حسن سے مختلف ہے اور اپنی شدید ترین شکل میں وہ شاعری کے حسن کو پہنچ جاتا ہے لیکن رہتا ہے نثر ہی کا حسن۔'' ☆۲

یہاں تنقید و تخلیق بغل گیر ہو کر ایک ہو جاتے ہیں۔ باقی مسافر تو اپنی اپنی داستانِ غم سنا کر رخصت ہو جاتے ہیں لیکن فاروقی اور علوی تنہائی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے بچھڑے مسافروں پر بحث کرتے لڑتے جھگڑتے آخر تک ساتھ چلتے ہیں اور ادھر قاری بھی سر دھنتا ہوا، حیران ہوتا ہوا، کچھ سوچتا ہوا، زیرِ لب مسکراتا ہوا اور ان کی نگاہوں سے بچتا ہوا (تا کہ وہ دل کی بھڑاس نکال ہی لیں) نظر آتا ہے۔

ہمارے ہاں کچھ لوگوں نے وارث علوی کی اس کتاب پر اعتراضات بھی کیے ہیں کہ یہ تنقید کی زبان ہی نہیں ہے۔ ان کے یہ اعتراضات اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہیں۔ یہ واقعی تنقید کی زبان نہیں ہے۔ یہ تو تخلیق کی زبان ہے جسے ایک ادب کا مارا ہوا تنقید میں نبھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لوگوں کی بے جا دشنام طرازیاں اس بات کی دلیل ہیں کہ واقعتاً وہ اپنی اس کاوش میں کامیاب ہے۔

طنز وارث علوی کی تنقید کا نمایاں وصف ہے لیکن یہ طنز ایک ایسے خود پسند نقاد کا نہیں ہے جو اپنی علمیت کے زعم میں ''بڑے بھائی'' کا کردار ادا کرتے ہوئے ہر کس و ناکس کی دھجیاں بکھیرتا ہوا، دوسروں کو روندتا ہوا گزر جاتا ہے۔ یہ طنز تعمیری ہونے کے ساتھ ساتھ جمالیاتی بھی ہے۔ ان کی بیسویں صدی کی آخری دہائی کے بعد لکھی گئی تنقیدوں میں یہ طنز جسم میں لہو کی طرح دوڑتا ہے۔ تنقید میں یہ وصف نبھانے کا گُر کوئی علوی صاحب سے سیکھے۔ منجھے

ہوئے لکھاری کی طرح ان کا اسلوب موضوع اور شخصیت کے ساتھ ساتھ بدلتا ہے۔ ''حالی، مقدمہ اور ہم'' کے پہلے ہی ورق پر مؤدب نقاد نے حالی کی تصویر کے ہر جُز کا اتنے مشاقانہ انداز سے جائزہ لیا ہے، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آنے والے ڈیڑھ سو صفحات ابتدائی ڈیڑھ صفحے پر موجود حالی کے تصویری خاکے کی تشریح و تعبیر ہوں۔ پوری کتاب میں وارث علوی کا قلم حالی کی تعظیم میں جھکا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن دوسری طرف جب وہ اپنے ہم عصر نقادوں پر خامہ فرسائی کرتے ہیں تو ان کا قلم تلوار کا روپ دھار لیتا ہے۔ ''فکشن کی تنقید کا المیہ'' اور ''خندہ ہائے بے جا'' اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ یہاں ان کا طنز ان کے باطنی کرب سے جنم لیتا ہے۔ اندرونی اضطراب سے پیدا ہونے والا لطیف طنز ''خندہ ہائے بے جا'' کے مضامین کو ادب کے عام قاری کے وجود کا حصہ بنا دیتا ہے۔ ''جدیدیت کی فلسفیانہ اساس'' میں گائیڈ اور طالب علم کے درمیان مکالمے کی تکنیک لاجواب ہے۔ ہم لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ لطف ہی لطف میں شمیم حنفی کی تنقیدی خامیوں سے بھی آگاہ ہو جاتے ہیں اور وارث علوی کی فنکاری سے بھی حظ اٹھاتے ہیں۔ ''خندہ ہائے بے جا'' کے سارے مضمون ایک افسانوی مجموعے کی طرح ہیں۔

''جدید افسانہ اور اس کے مسائل'' افسانے کی تفہیم کے حوالے سے اردو ادب کی معتبر کتاب ہے۔ یہ کتاب چونکہ افسانے کی تکنیک پر لکھی گئی ہے، اس لیے اس کی زبان کسی حد تک کثیف ہو گئی ہے لیکن بوجھل ہرگز نہیں ہے۔ یہ تنقیدی فن پارہ پڑھتے ہوئے ہم اور ہی طرح سے محظوظ ہوتے ہیں۔ اعلیٰ تخلیق کی طرح وارث علوی کی تنقیدیں قاری کو اندر سے بدلتی ہیں اور تبدیلی کے بعد ہی اسے نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اپنی اس پوری کتاب میں جدید افسانے کے متعلق اس طرح حتمی رائے دیتے چلے جاتے ہیں کہ قاری پڑھنے کے ساتھ قائل ہوتا چلا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر:

> ''کہا جاتا ہے کہ جدید افسانے کی زبان اپنے پیش رو افسانے کے مقابلے میں زیادہ علامتی، استعاراتی اور اسطوری ہونے کے سبب شاعری کی زبان سے زیادہ قریب ہو گئی ہے۔ مجھے اس رائے سے سخت اختلاف ہے۔ اختلاف کی وجہ یہ نہیں کہ میں نثر اور شعر کی بکتر بند تقسیم کا قائل ہوں۔ میں تو بڑے شاعر اور بڑے افسانہ نگار کے نابغہ کو نوعیت کے اعتبار سے ایک ہی خیال کرتا ہوں اور ایڈمنڈ ولسن کے اس خیال سے متفق ہوں کہ جہاں تک جینیس کا تعلق ہے۔ فلابیئر اور دانتے میں بہت فرق نہیں۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ افسانہ اور شاعری کی ٹوٹتی حدوں کا سلسلہ بہت پہلے ہی فلابیئر کے زمانے سے شروع ہو چکا تھا۔ آخر ہم ایذرا پاؤنڈ کا یہ قول کیوں یاد نہیں رکھتے کہ جدید زمانے میں شاعری کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی فلابیئر کی نثر کے حسن سے واقف ہو۔'' ☆۳

وارث علوی کا وہ عملی کام جو ''منٹو: ایک مطالعہ'' کی شکل میں ہم تک پہنچتا ہے، اردو ادب میں منٹو پر لکھی گئی تنقیدوں میں سے سب سے معتبر ہے۔ یوں تو پوری کتاب عاشق شاعر کے محبوب کی تعریف میں لکھے گئے شعر کا درجہ رکھتی ہے لیکن ان کے تجزیے پڑھ کر سوائے سبحان اللہ، سبحان اللہ کے ہمارے منہ سے کچھ نہیں نکلتا۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ اس طرح کی تحریریں فطرتاً متجسس قاری کو خدا کے قریب کر دیتی ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ ''بابو گوپی ناتھ''، ''بو''، ''ہتک'' اور ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' پر لکھے گئے مضامین یوں محسوس ہوتا ہے جیسے نقاد نے فن پاروں کو تنقید کے قالب میں ڈھال کر اپنے نام کر لیا ہو۔ یہاں قاری یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ وہ افسانے سے لطف اندوز ہو رہا ہے یا تنقید سے۔ بلکہ اگر میں مبالغے سے کام نہیں لے رہا تو ایسا لگتا ہے جیسے منٹو نقاد کے روپ میں خود اپنے افسانوں کا تجزیہ کر رہا ہو۔ اچھی تنقید وہ ہوتی ہے جو فن پارے کی زبان سے انحراف نہ کرے۔ نقاد جب تک تخلیق کے آگے ہاتھ باندھ کر عجز سے کھڑا نہ ہو، وہ اس پر معنی کے رموز وا نہیں کرتی۔ اچھی عملی تنقید فن پارے کے سائے میں پروان چڑھتی ہے۔ فن پارے کی تفہیم میں اپنی طرف سے معنی ٹھونسنے کا کام آج کل ہمارے بہت زیادہ ہو رہا ہے۔ ایسی تنقید قاری پر رعب و دبدبہ تو طاری کر دیتی ہے لیکن اسے فن پارے کے قریب پھٹکنے نہیں دیتی۔

وارث علوی ان خامیوں سے مبرّا ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کو وارث علوی نے ایک جگہ ان لفظوں میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے کہ ''فاروقی کی انگلیوں کا لمس پاتے ہی شعر اپنے معنی اگل دیتا ہے۔'' ☆۴ اگر ہم یہ کہیں کہ علوی کی انگلیوں کا لمس پاتے ہی افسانہ اپنے معنی اگل دیتا ہے تو کچھ غلط نہیں کہیں گے۔

ان عملی تنقیدی مضامین میں تجزیے اور تاثر کی اکائی نے حسنِ بیان کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ ان کا دوسرا وقیع کام راجندر سنگھ بیدی پر ان کی کتاب ''بیدی۔۔ایک مطالعہ ہے''۔ دو حصوں پر مشتمل ہے اس کتاب میں انہوں نے ایک طرف تو بیدی کے تخلیقی آرٹ کو کلی حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے جبکہ دوسرے اور اہم حصے میں انہوں نے ان کے تقریباً ساٹھ کے قریب افسانوں کا فرداً فرداً تجزیہ کیا ہے۔ ان تجزیوں سے نہ صرف بیدی کے فن کو موضوع اور ہیئت کے حوالے سے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اردو میں راجندر سنگھ بیدی کے آرٹ پر اس سے بہتر کتاب کوئی نہیں ہے۔

''اوراقِ پارینہ''، ''بورژواژی، بورژواژی''، ''لکھتے رقعہ، لکھے گئے دفتر'' اور ''ادب کا غیر اہم آدمی'' میں وارث علوی کا اسلوب ایک اور انگڑائی لیتا ہے۔ ان سے پہلے لکھی گئی تنقیدوں میں وہ کہیں کہیں جھنجھلا بھی اٹھتے ہیں لیکن یہاں ایک پرسکون بہاؤ ہے جیسے تیز و تند سیلاب کا ریلا آ کر تباہی مچا کر گزر چکا ہو۔ خصوصاً ''لکھتے رقعہ، لکھے گئے دفتر'' کے اوراق میں ہمارا سامنا ایک ایسے فرد سے ہوتا ہے جو زندگی کے نشیب و فراز دیکھ چکا ہو۔ ان مضامین میں طنز وہ طنز نہیں ہے جس کا ذکر ہم پچھلے صفحات میں کر چکے ہیں بلکہ یہاں وہ تنقید کی خرابیوں پر کفِ افسوس ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جب دوسرے صاحبِ علم اپنے علم کا صحیح استعمال نہیں کرتے تو وارث علوی جیسا ادب کا حساس قاری خون کے آنسو روتا ہے۔ فاروقی کے جدیدیت اور نارنگ کے مابعد جدیدیت کے عقیدے کے خلاف وارث

علوی نے بہت لکھا ان کے خیال میں ادب کی تفہیم اسی وقت ممکن ہے جب تعصب کی عینک اتار کر اس کے مطالعہ کیا جائے۔ان دو بڑے ناقدین نے ادب کو غیر ادبی معیارات سے پرکھنے کی کوشش کی جس نے ہمارے قاری کی صحیح تربیت تو کیا کرنی تھی الٹا اسے فن پاروں سے ہی دور کر دیا۔

''نقاد خود کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رہا ہے اور جس بلندی پر خود کو گامزن کئے ہوئے ہے۔اس کے نصیبوں میں پستی لکھی ہوئی ہے۔تنقید میں عروج و زوال بہت تیزی سے آتا ہے۔خصوصا اس تنقید میں جو تحریکوں اور نظریوں کے سہارے چلتی ہے کیونکہ تحریک اور نظریہ کے ختم ہوتے ہی وہ دم توڑ دیتی ہے۔اسی لیے تنقید کو اپنے فن کا گھونسلہ بڑے فنکاروں کے فن میں بنانا چاہیے کہ ان کی عمر اس سے الگ ہے۔فن کے حضور ابھی ہم نے انکسار کے آداب نہیں سیکھے۔''☆۵

دوسری طرف ان کے قلم کا اطمینان ''ناول بن جینا بھی کوئی جینا ہے'' کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ناول سے بے پناہ محبت کا اظہار وہ ان لفظوں میں کرتے ہیں۔''میرے کچھ خواب نہ سہی، کچھ خوف ضرور ہیں۔مجھے خوف آتا ہے اس وقت سے جب مجھے ایسی دنیا میں جینا پڑے جہاں پڑھنے کے لیے ناول نہ ہو۔''☆۶

وارث علوی نے اپنے وجود میں متجسس قاری کو ہمیشہ زندہ رکھا ہے جو اچھا ''تخلیقی کھلونا'' ملنے پر خوش ہوتا ہے، بغلیں بجاتا ہے لیکن جہاں اس کا استحصال ہوتا ہے، وہ خاموش نہیں بیٹھتا بلکہ احتجاج کرتا ہے اور اپنے احتجاج میں ہر فرد کو شریک کرنے کا خواہاں ہوتا ہے۔

یہاں ہم نے دانستہ طور پر وارث علوی کی ابتدائی کتب کا ذکر نہیں کیا۔دراصل ان کتابوں میں شامل مضامین میں اسلوب پر ''تنقید'' کی اجارہ داری ہے اور ہم صرف اسلوب پر بات کر رہے ہیں۔البتہ حال میں ہی شائع ہونے والے تنقیدی مجموعے ''سرزنشِ خار'' میں شامل شاعری پر لکھے گئے مضامین میں وہ خود سے منحرف ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔یہاں ان کا اسلوب و تجزیہ تنزلی کا شکار ہیں۔وہ ایک ایسے بوڑھے کے روپ میں نظر آتے ہیں جو بچوں کی دلجوئی کے لیے ان کی تعریف کر رہا ہو۔ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے شاعری پر نہیں لکھا، لکھا اور خوب لکھا۔ اقبال، راشد اور باقر مہدی پر لکھے گئے مضامین صاحبِ اسلوب نقاد کی صاحبِ اسلوب شعرا سے باطنی ہم آہنگی کی عکاسی کرتے ہیں۔پھر ''جبریل و ابلیس'' تو شعری تجزیوں میں اپنی مثال آپ ہے۔بلاشبہ یہ اردو کی بہترین نظموں سے ایک ہے۔اردو کے بیشتر نقادوں نے اس نظم پر خامہ فرسائی کی ہے لیکن انہوں نے اس نظم کی فنی خوبی کی بجائے اس کی فکر پر ہی فوکس کیا ہے جو کہ قدرے آسان راستہ ہے۔اس موضوع پر مغربی شعرا کی لکھی گئی طویل نظموں سے موازنہ کرتے ہوئے وارث علوی ہمیں بتاتے ہیں کہ

''ابلیس مغربی ادب میں بہت سی نظموں اور ڈراموں کا موضوع رہا ہے۔لیکن اقبال کی اس نظم کی

برابری کی کوئی چیز کہیں نظر نہیں آتی۔ ایسا لگتا ہے کہ گوئٹے، ورلین، برنارڈ شاہ وغیرہ نے اپنے ڈراموں کے ذریعے شیطان کے متعلق جو کہنا چاہا ہے اس سے کہیں زیادہ اور گہرا اقبال نے اپنی نظم میں سمو دیا ہے۔ معنی کے لحاظ سے یہ نظم سمٹا ہوصحرا ہے۔ صدیوں سے پھیلے ہوئے اساطیر، عظیم مذاہب کے عقائد اور اسرار کائنات اور رموز حیات سے متعلق بڑے فلسفیانہ تصورات، تکوینی فکر کی ایسی کرن میں بدل گئے ہیں جو نظم کے لفظ کو ایک نئی بصیرت سے منور کرتی ہے۔'' ☆۷

لیکن ذرا ٹھہریے، ہم خود ہی تو یہ کہہ کر اپنی حدود کا تعین کر چکے ہیں کہ وہ بنیادی طور پر فکشن کے نقاد ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم ان کی تنقید نہیں بلکہ اسلوب کی انفرادیت کو دریافت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ افکار کی پرکھ دلیل سے کی جاتی ہے لیکن اسلوب کی دنیا محسوسات کی دنیا ہے اور احساسات دلائل کی قید میں نہیں آتے۔ جب ہم وارث علوی کی تنقید پر بات کریں گے تو دلائل کا سہارا ضرور لیں گے۔ ہمارے لیے تو ان کے تنقیدی مجموعوں کے عنوان بھی کلیدی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے عنوانات ان کی شعر و ادب سے شدید محبت کا مظہر ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ وارث علوی اگر فکشن کا صاحبِ طرز نقاد نہ ہوتا تو کتنا بڑا ناول نگار یا افسانہ نگار ہوتا۔ کچھ بعید نہیں ہے کہ وارث علوی نے کبھی فرصت کے لمحوں میں یہ بات سوچی ہو۔

کتنی عجیب بات ہے کہ فن پارے کی تفہیم میں نقاد تخلیق کار سے آگے نکل جاتا ہے لیکن پھر بھی اس کا سر تخلیق کے آگے خم رہتا ہے۔ یہاں ہم نے وارث علوی کے تنقیدی اسلوب پر گفتگو کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے نقادوں کی طرح ان کی ہر بات بھی حرفِ آخر نہیں ہے۔ ان سے اکثر جگہوں پر اختلاف کی گنجائش نکل آتی ہے۔ بہر حال اسلوب سے اختلاف تو ممکن ہی نہیں ہوتا۔ اسلوب سے اختلاف بہتر اسلوب سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ اگر ادب کا کوئی متحیر قاری تنقید و تخلیق سے قربت کا متمنی ہے تو وہ بسم اللہ پڑھ کر وارث علوی کی تنقیدی دنیا میں کود پڑے۔ اس کے لیے جواہر پارے سمیٹنا مشکل ہو جائے گا۔

حواشی

۱۔ وارث علوی، ادب کا غیر اہم آدمی (دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۱)، ص ۱۳۔

۲۔ وارث علوی، جدید افسانہ اور اس کے مسائل (کراچی: آج کی کتابیں، ۲۰۰۲)، ص ۴۶۔

۳۔ وارث علوی، جدید افسانہ اور اس کے مسائل (کراچی: آج کی کتابیں، ۲۰۰۲)، ص ۵۴۔

۴۔ وارث علوی، ادب کا غیر اہم آدمی، ص ۲۸۔

۵۔ وارث علوی، لکھتے رقعہ، لکھے گئے دفتر (دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۱)، ص، ۱۶۷۔

۶۔ وارث علوی، ادب کا غیر اہم آدمی، ص، ۹۹۔

۷۔ وارث علوی، بورژوا اژی بورژوا اژی (دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس،۱۹۹۹ء)،ص ۱۲۶۔

مآخذ

۱۔ وارث علوی۔ادب کا غیر اہم آدمی۔دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۱۔

۲۔ وارث علوی۔جدید افسانہ اور اس کے مسائل۔کراچی: آج کی کتابیں،۲۰۰۲۔

۳۔ وارث علوی۔لکھتے رقعہ، لکھے گئے دفتر۔دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۱۔

۴۔ وارث علوی۔بورژوا اژی بورژوا اژی۔دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس،۱۹۹۹ء۔